پر انہیں تو فارغ کر دیا گیا؛ لیکن ان کے سرپرستوں کو گرفتار کر کے تشدد کیا گیا۔

یہ تو تھی انتظامیہ اور عدالت کی قانونی کارروائی۔ لیکن پورے مسئلے کا جائزہ لیا جائے تو ایک طرف مذموم بچگانہ شرارت تھی اور دوسری طرف اس چھوٹے سے واقعے کو بدامنی اور افراتفری پھیلانے کا زرین موقع سمجھ کر انتہائی مبالغہ آمیز اشتعال انگیزی کی دیدہ و دانستہ کوشش، جس کا ہر مقامی شخص گواہ ہے جنہوں نے مسجد کے لاؤڈ سپیکر پر امام جمعہ و جماعت صاحب کی انتہا پسندی کو سن لیا۔ اس کے ردعمل میں راتوں رات درجنوں گاڑیوں میں مشتعل لوگ وہاں پہنچ گئے۔ سنا ہے کہ نو واردوں پر اصل صورت حال واضح ہوئی تو انہوں نے مذکورہ صاحب کی مذمت کی۔ لیکن کل تک امن و مروت کا درس دینے والے قائدین کو یہ توفیق نہیں ہوئی کہ دانستہ غلط بیانی کرنے والے کو گرفتار کر کے کوئی ''راست اقدام'' اٹھانے کا مطالبہ کرتے۔

امن اور اتحاد کے داعیوں کو یہ حقیقت کبھی نہیں بھولنا چاہیے کہ امن و امان اور مذہبی رواداری جو کہ ہر ایک فرد اور ہر ایک جماعت کی شدید ضرورت ہے؛ کبھی یک طرفہ طور پر حاصل نہیں ہو سکتی۔ اور اگر کبھی دھونس دھمکی اور سرکاری دباؤ کے تحت اس کا اعلامیہ جاری کروالیا جائے، تو وہ ہرگز پائیدار اور مفید نہیں ہو سکتا۔

امن و امان اور مذہبی رواداری کی پائیدار فضا قائم کرنے کے لیے ہر شخص کو ذاتی طور پر اس ضرورت کا احساس کرنا چاہیے۔ زیادہ تر ذمہ داری مذہبی و سماجی نمائندوں پر عائد ہوتی ہے کہ ایسی کسی شرارت کے موقع پر حقیقی صورت حال کا منصفانہ جائزہ لے کر معاملہ رفع دفع کرنے کی پرخلوص کوشش کریں۔

مذہبی رواداری اور امن و امان کی پیار بھری فضا کے قیام کے لیے انتہائی ناگزیر ہے کہ عوام الناس اور خاص کر قیادت کی سطح پر انتہا پسندی سے پرہیز کیا جائے۔ تاریخی واقعات کو ''تاریخ'' ہی رہنے دیا جائے۔ دین اسلام کے احکام رسول اللہ ﷺ سے ہم تک جن جن ہستیوں کے ذریعے پہنچے ہیں ان تمام کا احترام کیا جائے۔ فرقہ وارانہ مذہبی تہواروں کو خاموشی سے اپنی اپنی عبادت گاہوں کی چاردیواری تک ہی محدود رکھا جائے۔ سرعام نعرہ بازی، پوسٹر اور چاکنگ کو مضبوط قانونی طاقت کے ذریعے روکا جائے۔ اور ان اقدامات کے بغیر خالی خولی اعلانات اور یک طرفہ کارروائیوں کے ذریعے امن و مروت اور اتحاد کا عظیم نصب العین ہرگز حاصل نہ ہونے پر یقین کامل رکھا جائے۔ اللہ تعالیٰ ہر مخلص قائد کا حامی و ناصر ہو۔ آمین

درسِ قرآن کریم

تراشِ رحمانی در فوائدِ قرآنی

ڈاکٹر محمد اسماعیل امین

قال اللّٰہ تعالیٰ: ﴿وَاِذْ قُلْتُمْ یٰمُوْسٰی لَنْ نُّؤْمِنَ لَکَ حَتّٰی نَرَی اللّٰہَ جَھْرَۃً فَاَخَذَتْکُمُ الصّٰعِقَۃُ وَاَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ ○ ثُمَّ بَعَثْنٰکُمْ مِّنْ بَعْدِ مَوْتِکُمْ لَعَلَّکُمْ تَشْکُرُوْنَ ○﴾

[سورۃ البقرۃ: ۵۵-۵۶]

ترجمہ: اور جب تم لوگوں نے کہا "اے موسیٰ! ہم جب تک اللہ تعالیٰ کو کھلم کھلا نہ دیکھ لیں آپ (کے کہنے) پر ہرگز ایمان نہیں لائیں گے"، پس تم پر بجلی آ گری، جبکہ تم دیکھ رہے تھے۔ پھر ہم نے تمہیں مر جانے کے بعد زندہ کیا، تاکہ تم شکر کرو۔"

سابقہ آیت سے ربط اور مختصر تفسیر

سابقہ آیت تک بنی اسرائیل کو اللہ تبارک وتعالیٰ کی نعمتیں یاد دلائی گئیں۔ اب ان نعمتوں کی ناشکری کے مختلف مناظر دکھائے جا رہے ہیں۔ زیرِ تفسیر آیتوں میں بنی اسرائیل کا اللہ تعالیٰ اور اس کی طرف سے مقرر نجات دہندہ محسن رسول حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ ایک سنگین گستاخی اور بے ادبی کا تذکرہ ہو رہا ہے۔

﴿واذ قلتم﴾ سے سابقہ آیت: ﴿وَاِذْ قَالَ مُوْسٰی لِقَوْمِهٖ یٰقَوْمِ اِنَّکُمْ ظَلَمْتُمْ اَنْفُسَکُمْ ......﴾ [البقرۃ ۵۴] پر عطف ہوا۔ ﴿اِذْ﴾ بمعنی واذکروا أیضاً یا بنی إسرائیل إذ قلتم ہے۔ یعنی "اے بنی اسرائیل! تم اس موقع کو بھی یاد کرو جب تم نے کہا۔" یہاں بھی سابقہ آیت کی طرح خطاب ہمارے نبی ﷺ کے زمانے میں موجود بنی اسرائیل یعنی یہود و نصاریٰ سے ہے۔ لیکن مذکورہ واقعات کا تعلق ہزاروں سال پہلے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانے کے بنی اسرائیل کے ساتھ ہے؛ کیونکہ باپ دادا پر کی ہوئی نعمتوں سے اس کی اولاد بھی مستفید ہوتی ہے۔ ﴿لن نؤمن﴾ میں لن حرفِ ناصب ہے اور یہ راجح قول کے مطابق مستقبل میں نفی تاکید کے لیے آتا ہے۔

"ایمان" کی تفصیلی بحث ﴿الَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِالْغَیْبِ﴾ [البقرۃ ۳] میں گزر چکی ہے۔ یہاں ﴿لَنْ نُّؤْمِنَ﴾ کے معنی یہ ہیں کہ ہم ہرگز آپ کی لائی ہوئی شریعت کی تصدیق نہیں کریں گے اور اسے تسلیم نہیں کریں گے۔

﴿حتیٰ نری اللہ جهرة﴾ میں "حتیٰ" غایت یعنی انتہا کے لیے ہے۔ یعنی جب تک اللہ پاک کو بالکل آنکھوں سے آمنے سامنے نہ دیکھ لیں۔

﴿نری﴾ یہ "رؤیت بصریة" یعنی دیکھ لینے کے معنی میں ہے، اس لیے ایک مفعول کی طرف متعدی ہے۔ اگر "رؤیت قلبية" یعنی دل سے سوچنے، جاننے یا خیال کرنے کے معنی میں ہوتا تو دو مفعولوں کی طرف متعدی ہوتا۔

﴿جَهْرَةً﴾ کے لغوی مفہوم میں "ظہور" کا معنی ہے۔ اسی سے فقہ میں الجهر بالقراءة اور الجهر بالمعاصی مشہور مسائل ہیں۔ اور یہاں مفعول مطلق ہونے کی وجہ سے منصوب ہے، جو کہ حال کی جگہ واقع ہے۔ بعض نے اسے ﴿قلتم﴾ کے فاعل کا حال کہا ہے۔ یعنی قلتم جهرةً "تم نے دیدارِ الٰہی کا مطالبہ صریح اور اعلانیہ طور پر کیا۔"

جمہور مفسرین نے اسے "رؤیتِ الٰہی" کا حال کہا، جو کہ مخصوص نوعیت پر دلالت کرتا ہے۔ یعنی "ہم اللہ تعالیٰ کو عیاں اور ظاہر، کھلم کھلا دیکھیں۔" اسی تفسیر کو حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ، قتادہؒ اور جمہور مفسرین نے راجح قرار دیا ہے۔

﴿فَأَخَذَتْكُمُ الصّٰعِقَةُ﴾ میں "فا" تعقیب کے لیے ہے۔ یعنی جب انہوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اپنے زعم باطل میں عاجز کرنے (اور شریعت کی پابندی سے جان چھڑانے) کے لیے ان سے دیدارِ الٰہی کا مطالبہ کیا، تو اس کے فوراً بعد انہیں "صاعقہ" میں مبتلا کر دیا گیا۔ امام ابن جریرؒ فرماتے ہیں: ﴿صاعقة﴾ ہر وہ ہولناک وخطرناک چیز ہے، جس کے دیکھنے، سننے، سامنا کرنے یا چھونے سے انسان ہلاک ہو جائے یا اس کا کوئی عضو ناکارہ ہو جائے یا اس کی عقل وفہم تلف ہو جائے؛ خواہ وہ آگ ہو، سخت چیخ ہو یا زلزلہ وغیرہ کی شکل میں ہو۔

یہاں "صاعقة" سے کیا مراد ہے؟ اس میں اسلافؒ سے مختلف اقوال مروی ہیں:

(۱) سخت زلزلہ آیا۔ جیسے کہ سورة الأعراف ۱۵۵ میں ہے: ﴿فَلَمَّآ أَخَذَتْهُمُ الرَّجْفَةُ﴾ "جب ان پر زلزلہ آیا" (۲) سخت چیخ کی آواز (۳) آگ، یعنی ان پر بجلی گری۔ حافظ صلاح الدین یوسف نے یہ توجیہ پیش کی ہے: ممکن ہے دونوں عذاب ہی آئے ہوں، اوپر سے بجلی کی کڑک اور نیچے سے زلزلہ۔

کیا اس عذابِ صاعقة سے وہ مر گئے تھے یا صرف بے ہوش ہوئے تھے؟

اس بارے میں دو اقوال ہیں: (۱) وہ بیہوش ہوئے تھے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: ﴿وَخَرَّ مُوسَىٰ صَعِقًا﴾ [الأعراف ۱۴۳] "اور حضرت موسیٰ علیہ السلام بیہوش ہو کر گر پڑے۔" (۲) وہ حقیقت میں مر گئے تھے۔ اسی لیے اس کے بعد ارشاد فرمایا: ﴿ثُمَّ بَعَثْنٰكُمْ مِّنْ بَعْدِ مَوْتِكُمْ﴾

"موت" کو حقیقی معنی پر رکھنا ہی اصل ہے؛ کیونکہ نیند وغیرہ کے معنیٰ میں "وفاۃ" کا لفظ استعمال ہوتا ہے، جبکہ "موت" اکثر و بیشتر حقیقی معنی میں آتا ہے۔ جیسے فرمانِ الٰہی ہے: ﴿اللّٰہُ یَتَوَفَّی الْاَنْفُسَ حِیْنَ مَوْتِھَا وَالَّتِیْ لَمْ تَمُتْ فِیْ مَنَامِھَا فَیُمْسِکُ الَّتِیْ قَضٰی عَلَیْھَا الْمَوْتَ وَیُرْسِلُ الْاُخْرٰٓی اِلٰٓی اَجَلٍ مُّسَمًّی﴾ [الزمر ٤٢] "اللہ پاک موت کے وقت جانوں کو اٹھالیتا ہے، اور جن کی موت نہیں آئی، انہیں نیند میں اٹھالیتا ہے۔ پھر جن پر موت کا فیصلہ ہو چکا ہے انہیں روک لیتا ہے، اور دوسری جانوں کو ایک مقررہ وقت تک کے لیے چھوڑ دیتا ہے۔" ﴿وَھُوَ الَّذِیْ یَتَوَفّٰکُمْ بِالَّیْلِ وَیَعْلَمُ مَا جَرَحْتُمْ بِالنَّھَارِ﴾ [الأنعام ٦٠] "اللہ وہی ذات ہے جو تمہیں رات کو (سوتے وقت) فوت کرتا یعنی اٹھالیتا ہے، اور دن کے وقت تم جو کچھ بھی (خیر وشر) کماتے ہو اس کو خوب جانتا ہے۔" یہی قول قتادہؒ سے صحیح سند کے ساتھ روایت ہے۔

﴿وانتم تنظرون ۝﴾ جملہ حالیہ ہے۔ اس کا ذوالحال ﴿فاخذتکم﴾ میں ضمیر مخاطب کُمْ ہے۔ یعنی تم اپنی آنکھوں سے مذکورہ صاعقہ کی "ابتدائی حالت" کو دیکھ رہے تھے۔ اس کی "آخری حالت" مراد نہیں، جس میں وہ سب فوت ہو چکے تھے، اور کوئی دیکھنے والا باقی نہ رہا تھا۔

﴿ثم بعثنکم﴾ "ثم" تراخی یعنی "تاخیر" کے معنی میں ہے۔

﴿بعثنکم﴾ "بعث" اصل میں ارسال (بھیجنے) کو کہا جاتا ہے۔ اور بعض کے نزدیک کسی کو اس کی جگہ سے اٹھانے کو بھی کہا جاتا ہے۔ زیر تفسیر آیت مبارکہ میں بعث' إحیاء یعنی "زندہ کرنے" کے معنی استعمال ہوا ہے۔ یعنی: "پھر ہم نے تمہیں زندہ کیا۔"

﴿مِن بعدِ موتِکم﴾ میں "موت" حقیقی معنی میں آیا ہے، جیسا کہ وضاحت گزر چکی ہے۔

بنی اسرائیل کی اس توہین آمیز حرکت کی وجہ سے جب اللہ تعالیٰ کے عذاب نے انہیں دبوچ لیا، تو وہ سب مر گئے۔ لیکن حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس موقع پر اللہ تعالیٰ سے آہ وزاری کے ساتھ دعا فرمائی، جس کا تذکرہ اللہ تعالیٰ نے اس طرح فرمایا ہے: ﴿وَاخْتَارَ مُوْسٰی قَوْمَہٗ سَبْعِیْنَ رَجُلًا لِّمِیْقَاتِنَا فَلَمَّآ اَخَذَتْھُمُ الرَّجْفَۃُ قَالَ رَبِّ لَوْ شِئْتَ اَھْلَکْتَھُمْ مِّنْ قَبْلُ وَاِیَّایَ اَتُھْلِکُنَا بِمَا فَعَلَ السُّفَھَآءُ مِنَّا﴾ [الأعراف ١٥٥] "اور حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم میں سے ستر افراد ہماری ملاقات کے لیے منتخب کر لیے، جب ان کو زلزلہ پیش آیا تو عرض کیا: اے میرے رب! اگر تو چاہتا تو اس سے قبل ہی ان کو اور مجھے بھی ہلاک کر دیتا! کیا تو ہمیں اس کام پر ہلاک کرتا ہے جو ہمارے نادانوں نے کیا!"

غرض اس دعا کی قبولیت میں اللہ تعالیٰ نے انہیں دوبارہ زندہ فرمایا۔ اسی نعمت الٰہیہ کے شکر کرنے کی ترغیب دلاتے ہوئے فرمایا: ﴿لعلكم تشكرون ○﴾ (لعل) علت یعنی سبب بتانے کے لیے آتا ہے۔ یعنی ہم نے تمہیں دوبارہ زندگی بخش کر بہت بڑا احسان فرمایا، تاکہ تم شکر گزار بن جائیں۔ [تفسیر الطبری، القرطبی، ابن کثیر، الشوکانی، تفسیر ابن العثیمین] "شکر" کی لغوی اور شرعی تعریف التراث ۴۴/۱۰ میں گزر چکی ہے۔

آیتوں سے استنباط کردہ فوائد:

فائدہ نمبر ۱: دونوں آیتوں میں اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل پر کی ہوئی نعمتوں کی یاددہانی کی ہے، کہ اللہ تعالیٰ نے تمہارے توہین آمیز مطالبے کی سزا میں ایک دفعہ موت دینے کے بعد دوبارہ زندگی عطا کی؛ تاکہ تم اپنی بقیہ زندگی اطاعت اور استقامت کے ساتھ گزارو!

فائدہ نمبر ۲: بنی اسرائیل کو اللہ تعالیٰ کی مختلف نعمتیں میسر آنے اور تصدیق و یقین پر آمادہ کرنے والی بہت ساری آیات واضح اور معجزات نمایاں ہونے کے باوجود ان کی بے وقوفی اور اللہ پاک اور اس کے رسول علیہ السلام کے ساتھ بے ادبی اور بے اعتنائی واضح ہو رہی ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام پر ایمان لانے کے باوجود انہوں نے کہا: ﴿لن نؤمن لك حتى نرى الله جهرة﴾ یہ ان کی پہلی گستاخی نہیں تھی۔ کبھی اللہ کو چھوڑ کر بچھڑے کی پوجا کر لی، کبھی طاغوت کی پرستش دیکھ کر اس قدر پسند کیا کہ اپنے رسول علیہ السلام سے الٹا مطالبہ کرنے کی جسارت کی: ﴿يٰمُوْسَى اجْعَلْ لَنَآ اِلٰهًا كَمَا لَهُمْ اٰلِهَةٌ﴾ [الأعراف ۱۳۸] "اے موسیٰ! ہمارے لیے بھی کوئی (ایسا ہی مجسم) معبود مقرر کر لو، جیسا کہ اس قوم کے ہاں بت ہیں۔" ☆

جب حضرت موسیٰ علیہ السلام انہیں فتح کی پیشگی بشارت کے ساتھ اللہ کی راہ میں قتال کا حکم فرماتے ہیں، تو "ایمان دار"

☆ "ظاہر پرستی" کے اسی شوق کو شاعرِ مشرق نے اس طرح اجاگر کیا ہے:

کبھی اے حقیقتِ منتظر! نظر آ لباسِ مجاز میں — کہ ہزاروں سجدے تڑپ رہے ہیں مری جبینِ نیاز میں
طرب آشنائے خروش ہو، تو نوائے محرمِ گوش ہو — وہ سرود کیا کہ چھپا ہوا ہو سکوتِ پردۂ ساز میں

یہ شعر حضرت علی رضی اللہ عنہ کی سالگرہ کے تہوار کے دن بلتستان کے محلہ "کول" کے بازار میں آویزاں بینر سے نقل کیا گیا ہے۔

(ابومحمد)

قوم کی طرف سے جواب ملتا ہے: ﴿اذهب انت وربك فقاتلا انا ههنا قاعدون ۞﴾ [سورۃ المائدۃ: ۲۴]

''آپ خود اپنے رب کے ساتھ جا کر جہاد کریں، ہم تو (فتح پانے تک) یہیں بیٹھے رہیں گے۔''

جب انہیں حکم دیا گیا کہ بیت المقدس میں داخل ہوتے وقت بخشش کی دعا مانگتے ہوئے اور سجدہ ریز ہوتے ہوئے داخل ہو جاؤ، پھر اس پر انہیں دنیا و آخرت دونوں کی بشارتیں بھی دیں، تو شرارت کرنے لگے: ﴿واذ قلنا ادخلوا هذه القرية فكلوا منها حيث شئتم رغدا وادخلوا الباب سجدا وقولوا حطة نغفر لكم خطيكم وسنزيد المحسنين ۞ فبدل الذين ظلموا قولا غير الذي قيل لهم﴾ [سورۃ البقرۃ: ۵۸، ۵۹] ''اور جب ہم نے حکم فرمایا کہ اس بستی میں داخل ہو کر جہاں سے چاہو بافراغت کھاؤ اور دروازے سے سجدہ کرتے ہوئے داخل ہو جاؤ اور ''معافی'' کہو: ہم تمہاری خطائیں معاف فرمائیں گے۔ اور ہم احسان کرنے والوں کو مزید نوازتے ہیں۔ پھر ان ظالموں نے اس بات کو جو ان سے کہی گئی تھی بدل ڈالی۔''

یعنی ان ناشکرے ظالموں نے ﴿حطة﴾ (معافی) کے بجائے ''حبة فی شعيرة'' کہنا شروع کر دیا یعنی (گندم کا) دانہ (خوشے کی) بالی میں''۔ اور سجدہ کرنے کے بجائے اپاہجوں کی طرح زمین پر سرینوں کو گھسیٹتے ہوئے شہر میں داخل ہوئے۔

ان واضح مثالوں سے بنی اسرائیل کی سرکشی اور توہین شریعت کا، اور اسی کے تناظر میں اللہ پاک کی شان حلم کے کمال کا بھی اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ قرآن مجید میں ان کی نافرمانیوں کے تذکرے کا اصل مقصد نبی آخر الزمان ﷺ کے زمانے میں موجود بنی اسرائیل کو تنبیہ کرنا اور ضد و عناد کے سنگین نتائج سے خبردار کرنا ہے کہ عاقبت کی فکر کرو، تمہارا رویہ بھی تمہارے اسلاف سے مختلف نہیں؛ تم نے ان کی تقلید میں آخری نبی ﷺ کے بارے میں تمہاری کتابوں میں موجود واضح پیشین گوئیوں کو محض تعصب اور ہٹ دھرمی سے نظر انداز کر کے کفر کا راستہ اختیار کر رکھا ہے۔ [الطبری]

فائدہ نمبر۳: ان آیتوں سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ شک و شبہ کی بنیاد پر کسی ناممکن چیز کا سوال کرنے والا سزا کا مستحق ہے۔ جیسا کہ بنی اسرائیل نے دنیا میں رؤیت الٰہی کا مطالبہ کیا، تو انہیں عذاب الٰہی نے پکڑ لیا۔ جبکہ یہی مطالبہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بھی کیا تھا: ﴿قال رب ارني انظر اليك﴾ [الأعراف: ۱۴۳] ''فرمایا: اے میرے رب! مجھے اپنا دیدار کرائیے، میں آپ کے دیدار کا بڑا ارمان رکھتا ہوں''۔ اس پر کسی ڈانٹ کے بغیر فرمایا کہ اس دنیا میں کسی مخلوق کے لیے اللہ کا دیدار ممکن نہیں۔ پھر اس کا ثبوت دکھانے کے لیے مضبوط و سنگلاخ پہاڑ پر تجلی فرما دی۔ جب اللہ کی تجلی سے ٹھوس اور آسمان سے باتیں کرتا پہاڑ ریزہ ریزہ ہو جائے تو بیچارے انسان کی کمزور آنکھیں کب برداشت کر سکیں گی؟!

بعض مفسرین نے سوال اٹھایا ہے کہ بنی اسرائیل اور حضرت موسیٰ علیہ السلام دونوں کا مطالبہ ایک تھا؛ لیکن بنی اسرائیل پرفوراً عذاب کیوں نازل ہوا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ دونوں مطالبوں کے اسباب اورانداز میں بہت زیادہ فرق تھا:

حضرت موسیٰ علیہ السلام کو محبتِ الٰہی کی شدت میں دیدارِالٰہی کی پرخلوص اور سچی رغبت پیدا ہوئی، تاکہ جس محبوب وعظیم ذات سے کلام کا شرف حاصل ہوا ہے، اس کی دید سے بھی دیدہ ودل کو قرار اور بے چین نفس کو سکون واطمینان حاصل ہو۔ اس پر اللہ علیم وخبیر نے آپ علیہ السلام کی نیت اور شوق کی مناسبت سے جواب مرحمت فرمایا۔ جبکہ بنی اسرائیل کے مطالبے کا اصل محرک اللہ پاک اوراس کے رسول معصوم علیہ السلام کے بارے میں شک وشبہ تھا۔ ان کا رویہ معاندانہ، ستم ظریف اور دھمکی آمیز تھا: ﴿لنْ نؤمنَ لکَ حتیٰ نری اللہَ جهرةً﴾ |ابن العثيمينؒ|

اس سے معلوم ہوا کہ ایمان لانے کی شرط کے طور پر اللہ تعالیٰ کو دیکھ لینے کا مطالبہ بہت بڑی گستاخی ہے۔

فائدہ نمبر۴: بدعتی اور گمراہ فرقوں جہمیہ اور معتزلہ وغیرہ نے زیرِتفسیر آیت مبارکہ سے شبہ ابھارتے ہوئے آخرت میں اللہ پاک کی رؤیت کا انکار کیا ہے۔ اسی لیے بعض مفسرین نے ان کے شبہات کا رد کرتے ہوئے یہاں آخرت میں رؤیتِ الٰہی کے دلائل کی طرف اشارہ کیا ہے۔

یہ مسلمہ حقیقت اور اہل سنت والجماعت کا مضبوط عقیدہ ہے کہ مؤمنین صادقین آخرت میں اللہ تعالیٰ کا دیدار کریں گے۔ اس ٹھوس حقیقت کا ثبوت واضح نصوص قرآنی کے ساتھ ساتھ متواتر اور قطعی الدلالت احادیث شریفہ سے ملتا ہے۔ اوراس پر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم، تابعین عظامؒ، محدثینؒ اور تمام اہل حق کا اجماع ہے۔ اس کے مقابلے میں اہل بدعت کے کلامی اور متزلزل شبہات اور باطل وکمزور دعوؤں کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔ |الشوكاني، القاسمي| اس مسئلے میں اہل سنت کے تفصیلی دلائل سے آگاہی کے لیے شرح العقيدة الطحاوية کا مطالعہ بہت مفید ہے۔

فائدہ نمبر۵: اگر کسی کو سزا مل رہی ہو اور دوسرے اسے دیکھ رہے ہوں، تو اس کی تکلیف مزید بڑھ جاتی ہے اور اذیت زیادہ سخت ہوتی ہے۔ یہی نقشہ یہاں بھی کھینچا گیا ہے: ﴿وانتم تنظرون ۝﴾ |ابن العثيمين|

فائدہ نمبر۶: زیرِتفسیر آیتوں میں اللہ تعالیٰ کا مردوں کو دوبارہ زندہ کرنے کی قدرت کاملہ کا بیان ہے۔ اور قیامت کے دن تمام انسانوں کو زندہ کرنے کا عقیدہ منکرین قیامت کے لیے ہمیشہ حیرت وتعجب کا باعث رہا ہے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے اس مسئلے کو قرآن مجید میں مختلف اسالیب میں جگہ جگہ بیان فرمایا ہے، اوراپنی قدرت کاملہ کو دلائل کے ساتھ واضح فرمایا ہے۔ سورۃ البقرۃ میں دنیا ہی میں کسی ذی روح کے مرنے کے بعد دوبارہ زندہ ہونے کی چھ مثالیں بیان فرمائی گئی ہیں:

(۱) زیرِ تفسیر آیت کریمہ

(۲) بنی اسرائیل میں ایک خفیہ قتل میں قاتل کا سراغ نہیں مل رہا تھا۔ آخر اللہ کے حکم سے بنی اسرائیل نے بمشکل ایک گائے ذبح کی۔ پھر اس کا ایک حصہ مقتول کو مارنے کا حکم دیا گیا۔ چنانچہ مقتول زندہ ہو گیا اور اپنے قاتل کی نشاندہی کی۔ اس کی تفصیل آیت [۶۷-۷۳] میں موجود ہے۔

(۳) اللہ نے ایک سابقہ امت کے واقعے میں بیان فرمایا: ﴿اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ خَرَجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ وَهُمْ اُلُوْفٌ حَذَرَ الْمَوْتِ فَقَالَ لَهُمُ اللّٰهُ مُوْتُوْا ثُمَّ اَحْيَاهُمْ﴾ [البقرة ۲۴۳] یعنی ہزاروں کی عظیم جماعت موت کے خوف سے اپنی بستی سے بھاگ نکلی، تو اللہ تعالیٰ نے ان سب کو موت دی، پھر رحم فرما کر انہیں نئی زندگی عطا فرمائی۔

(۴-۵) سابقہ امتوں میں سے ایک نبی -مشہور قول کے مطابق حضرت عزیر علیہ السلام- کا گزر ایک کھنڈر بستی سے ہوا، جو چھتوں کے بل گری پڑی تھی۔ بستی کی بربادی پر تعجب کرتے ہوئے آپ علیہ السلام کے منہ سے نکل گیا: "اللہ تعالیٰ اس کو کیسے زندہ کرے گا!" تو اللہ پاک نے اس بندے کو ایک صدی تک موت دینے کے بعد دوبارہ زندہ فرمایا۔ پھر اس کے سامنے ہی اپنے مردہ و بوسیدہ گدھے کو بھی دوبارہ زندہ فرمایا۔

(۶) حضرت ابراہیم علیہ السلام کے مخلصانہ مطالبے پر ان کی اطمینانِ قلبی کو کمال تک پہنچانے کی خاطر اللہ تعالیٰ نے چار پرندوں کو خود حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ہاتھوں ذبح کروا کر پھر زندہ کیا۔ جس کا بیان آیت ۲۶۰ میں آیا ہے۔

مذکورہ بالا واقعات اور اللہ پاک کے حکم سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ہاتھوں مردہ انسانوں کا زندہ ہونا اور مٹی سے بنائے ہوئے پرندوں کے ڈھانچوں کا زندہ ہو کر اڑ جانا ایسے امور ہیں، جو اللہ تعالیٰ کے نافذ کردہ عام قانونِ فطرت سے ہٹ کر اس کی قدرتِ کاملہ کے اظہار اور انبیاء کرام علیہم الصلاۃ والسلام کی سچائی ظاہر کرنے اور کفار و مشرکین کے اوپر اتمامِ حجت کے لیے ہوتے ہیں۔ [تفسیر ابن العثیمین]

اگر قدرت الٰہیہ سے کوئی شخص دوبارہ دنیا میں زندہ ہو جائے تو کیا وہ پھر سے مکلّف ہو جائے گا؟

اللہ تعالیٰ کا عام قانونِ شریعت یہی ہے کہ انسان مرنے کے بعد عبادات اور شرعی ذمہ داریوں سے آزاد ہو جاتا ہے، اور اس کی سابقہ زندگی کا احتساب ہوتا ہے۔ لیکن زیرِ بحث مسئلے میں اختلاف ہے۔

راجح قول کے مطابق اس دنیا میں دوبارہ زندہ ہونے والا شخص مکلّف ہی رہے گا؛ کیونکہ دنیا میں رہ کر کسی کو عبادات اور شرعی ذمہ داریوں سے آزاد قرار دینا غیر معقول اور مقاصدِ شریعت سے بعید ہے۔